فکرِ تصوف اور کلام نظیر

ڈاکٹر سرفراز جاوید

R-155، تھرڈ فلور، گلی نمبر 6، سرسید روڈ، جوگا بائی ایکسٹینشن، جامعہ نگر، نئی دہلی، موبائل: 9971895740

ولی محمد نظیر اکبر آبادی کا جنم دلّی میں ہوا۔ زندگی اکبر آباد یعنی آگرے میں بسر ہوئی۔ وہاں انھوں نے معلّمی کا پیشہ اختیار کیا۔ نظیر وہاں کی مستقل بود و باش کے باعث اکبر آبادی کہلائے۔ ان کا مزاج بڑا ہی قلندرانہ تھا۔ وہ ہر مذہب وملت کے عوام میں یکساں مقبول تھے۔ ہاں اشرافیہ طبقہ انھیں قابل اعتنا نہیں سمجھتا تھا، مگر ان کو عوام عزت واحترام سے دیکھتے اور سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ معاصر اشرافیہ طبقہ میں ان کے کلام کی قطعاً پذیرائی نہیں ہوئی۔ کیوں کہ اس طبقہ نے زبان و بیان کی رو سے اپنے تہذیبی وادبی معیار مقرر کر رکھے تھے، جس کے باعث کلامِ نظیر ان کی کسوٹی پر کھرا نہیں اترتا تھا۔ اسی لیے نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے 'تذکرۂ گلشن بے خار' میں ان کا تذکرہ تحقیر آمیز الفاظ میں کیا ہے۔ مزید طرفہ تو یہ کہ محمد حسین آزاد نے 'آب حیات' میں ذکر تک نہیں کیا۔ جب کہ وہ نظمیہ روایت کے قطعی فطری شاعر تھے بلکہ ان کا مزاج ہی نظم سے میل کھاتا تھا۔ کیونکہ نظم ہی حقیقت میں مسلسل موضوع کی حامل ہوتی ہے، جس میں کسی مضمون کو تسلسل کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔

کلام نظیر کے سرسری مطالعہ سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ خالص انسانیت پرست شاعر تھے۔ جو تصوف کا خاص موضوع بھی ہے۔ وہ قلندرانہ اوصاف اور تصوفانہ مزاج رکھتے تھے۔ ان کے یہاں امن وامان اور انسانیت کا پیغام نمایاں طور پر ملتا ہے۔ ان کا دور سیاسی ابتری کا دور تھا۔ اس دور کے حالات کی عکاسی ل احمد کی تحریر میں کچھ اس طرح ملتی ہے:

> ''میاں نظیر نے ہوش سنبھالا تو ایک طرف رومی وعطار، سعدی، حافظ، تلسی وکبیر، نانک اور سورداس کے نغموں سے فضا معمور تھی اور دوسری طرف تیموری خانوادے کی باجبروت سلطنت، اکبر اعظم کی عظیم الشان حکومت دم توڑ رہی تھی۔ یہ ماحول اگر ایک ذکی الحس اور صاحب بصیرت انسان کو عالم کی بے ثباتی کا سبق دے تو اچنبھے کی بات بھی نہیں ہے، پورے ملک میں اور اس لیے مسلم سماج میں بھی تقلید وقدامت پرستی اپنے عروج پر پہنچ گئی تھی مگر اسی سماج کے اندر مذہب محبت کے مبلغ بھی پیدا ہو رہے تھے چنانچہ نظیر کے ماحول نے انھیں بھی اسی آفاقی مذہب کے راستے پر ڈال دیا۔''

نظیر اکبر آبادی یوں تو باقاعدہ خانقاہی جبہ پوش صوفی مزاج نہیں تھے۔ مگر ان کے کلام میں قناعت پسندی اور بے نیازی کی تعلیم جگہ جگہ نظر آتی ہے، انھوں نے عام فریبی صوفیوں کی مانند دنیا بے زاری کا سبق بھی نہیں دیا۔ یہی وجہ ہے انھوں نے زندگی کی بقا کے لیے ناگزیر اشیا پر بہت سی نظمیں قلم بند کی ہیں۔ مزید ایسی نظمیں بھی لکھیں جو اس عہد کے معاشرے میں رائج کھیل تماشے اور گھریلو ماحول کی بھرپور نمائندگی کرتی ہیں۔ جیسے چولہا، توا، دال، روٹی، چنا، مٹر، چپاتی، نان، کوڑی، پیسہ، روپیہ، ریچھ کا بچہ، کل جگ، مفلسی، آگرے کی تیراکی، موتی وغیرہ۔ ہاں یہ موضوعات ہم عصر اردو شعرا میں قطعی اہمیت کے حامل نہیں تھے۔ نظیر نے ان سب کی پروا کیے بنا عوام کی ضرورتوں کے مدنظر عام اور سوقیانہ موضوعات پر خوب لکھا۔

نظیر اکبر آبادی عوامی طرز فکر سے تعلق رکھنے والے صوفی منش شاعر تھے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں عوام کا حقیقی آئینہ پیش کیا ہے۔ کل جگ، آئینہ، بنجارہ نامہ اور فقیروں کی صدا ایسی نظمیں ہیں جن میں انسانی حیات کی دائمی حقیقت سے نوع بشر کو فکر وآگہی حاصل ہوتی ہے۔ انھوں نے افکار وخیالات کی ترسیل وتفہیم میں سہل نگاری کے ساتھ رعایت لفظی سے بھی کام لیا ہے۔ انھوں نے نظموں کے عنوانات کو مدنظر رکھتے ہوئے عقبیٰ وآخرت کے پہلو پر کافی زور دیا ہے، جو تصوف کا خاص وظیفۂ حیات ہے۔ ان کی اس موضوع سے متعلق نظمیں اتنی پُر تاثیر ہیں۔ جس سے قاری کا ذہن مادی دنیا سے ماورا ہو کر فکر عقبیٰ میں محو ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ وہ نظموں کے آغاز ہی میں حیات وزیست کے حقیقی معاملات کو پیش کر دیتے ہیں اور قاری اسی کے سحر میں گم ہو جاتا ہے۔ یہ نظمیں بظاہر موضوعات کے لحاظ سے معمولی ضرور ہیں مگر فکر وخیال اور فن شعر کے تعلق سے بلند درجہ کی

حامل ہیں:

اپنے نفع کے واسطے مت اور کا نقصان کر
تیرا بھی نقصان ہووے گا اس بات پر تو دھیان کر
کھانا جو تو کھا دیکھ کر پانی ہے پیے تو چھان کر
یاں پاؤں کو رکھ پھونک کر، اورخوف سے گزران کر
کل جگ نہیں کر جگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہات دے اس ہات لے

اس بند میں عوام کو یہ نصیحت کی ہے کہ ہمیں اپنے ذاتی منافع کی خاطر دوسروں کا نقصان نہیں کرنا چاہیے، مگر خود بھی اس طرح محتاط اور چاق وچوبند ہونا ضروری ہے، جس میں اپنا نقصان بھی نہ ہونے پائے۔ مزید ہر حال میں یعنی کھانا پانی، چلتے پھرتے اور جملہ امور میں احتیاط برت کر خوف سے گزران کرنا چاہیے۔ درحقیقت یہ زمانہ کل جگ نہیں بلکہ کر جگ ہے۔ ہمیں اپنے لین دین میں کسی طرح کی کوئی چالاکی یا ٹال مٹول نہیں کرنا چاہیے۔ ہم اس دنیا میں نہ جانے کس قدر مصروف ہیں کہ ہمیں ایک لمحہ کی بھی فرصت نہیں اور دل میں ہر چیز کے لیے ہوس موجود ہے۔ جس کو اپنا اپنا کرتے رہتے ہیں، لیکن جس روز اجل کی پکار آجائے گی تو سب کچھ یہیں پڑا رہ جائے گا۔ یہ بات ایک صوفی مزاج شخص ہی کہہ سکتا ہے۔ کیوں کہ صوفی منش شخص کو فانی دنیا کی عیش وآسائش سے دلچسپی نہیں ہوتی۔ اس پر یہ حقیقت ہر وقت عیاں رہتی ہے کہ ایک روز دنیا کو چھوڑنا یقینی ہے۔ عیش وآرام کے تمام وسائل ولوازمات یہیں رہ جائیں گے بلکہ فنا ہو جائیں گے۔ اس لیے نظیر بنجارہ کی تمثیل کے ذریعہ دنیادار لوگوں کو آگاہ کرتے ہیں:

یہ دھوم دھڑکا ساتھ لیے، پھرتا ہے جنگل جنگل
اک تنکا ساتھ نہ جاوے گا موقوف ہوا جب ان اور جل
گھر بار اٹاری، چوبارے، کیا خاصا، تن سکھ اور مخمل
کیا چلون، پردے، فرش نئے، کیا لال پلنگ اور رنگ محل
سب ٹھاٹ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

حقیقت یہی ہے کہ انسان کو گھر بار اور مال ودولت میں قوت لایموت سے زیادہ دلچسپی اور فخر وغرور تو قطعاً نہیں جتلانا چاہیے۔ کیونکہ ایک روز سب کچھ یہیں پر چھوٹ جائے گا۔ یعنی جب ملک الموت انسان کی روح قبض کرے گا، تو اس وقت انسان کا کوئی مکر وحیلہ بھی کام نہیں آئے گا۔ کیونکہ وہ اپنے مقدرِ حیات کے سب تماشے دیکھ چکا۔ اب تو صرف آنکھیں بند کرنے کا حکم آچکا ہے یعنی موت کا نقارہ بج چکا ہے۔

اب تو بساط زندگی لپیٹنے کی فکر کرو:

گھر بار روپے پیسے میں مت دل تم خرسند کرو
یا گور بناؤ جنگل میں یا جمنا پر آنند کرو
موت آن لتاڑے گی آخر کچھ مکر کرو کچھ پھند کرو
بس خوب تماشہ دیکھ چکے اب آنکھیں اپنی بند کرو
تن سوکھا، کبڑی پیٹھ ہوئی، گھوڑے پر زین دھرو بابا
اب موت کا نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

نظیر نے بھی صوفیوں کی طرح مادی دنیا کا مشاہدہ قلب ونظر سے کرلیا تھا۔ ان پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہوگئی تھی کہ دنیا کے جملہ لوازمات کسی کے وفادار نہیں ہوئے ہیں۔ اس نے جو دوسروں کے ساتھ کیا ہے وہی سلوک تیرے ہمراہ بھی کریں گے۔ دنیاوی مال واسباب انسانی تحویل میں وقتی طور پر ضرور گھٹتے بڑھتے رہتے ہیں، مگر یہ دولت اپنے ہرخواہش مند کو پریشان کرتی رہتی ہے، جو انسان کے مرتے وقت بھی غضب کا موجب بنے گی:

یہ تو نہ کسی کے پاس رہی ہے نہ رہے گی
جو اور سے کرتی رہی وہ تجھ سے کرے گی
کچھ شک نہیں اس میں جو بڑھی ہے سو گھٹے گی
جب تک تو جیے گا تجھے یہ چین نہ دے گی
اور مرتے ہوئے پر یہ غضب لائے گی بابا

نظیر اپنے عقیدہ کی رو سے لوگوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ جو بھی انسان مال ومتاع چھوڑ کر مرے گا، اس کے وارثین جب مال کا بیجا استعمال کریں گے، تو اس کی روح قبر میں چلائے گی۔ اسی لیے مال ودولت سے صندوق بھرنا کار بے سود ہے۔ آخر ایک دن تو یہ دنیا خالی ہاتھ ہی چھوڑ کر جانا پڑے گا۔ تاہم قیامت میں مزید احتساب کے مرحلہ سے گزرنا پڑے گا:

تو لاکھ اگر مال کے صندوق بھرے گا
ہے یہ تو یقیں آخرش ایک دن تو مرے گا
پھر بعد ترے اس پہ جو کوئی ہاتھ دھرے گا
وہ ناچ مزا دیکھے گا اور عیش کرے گا
اور روح تری قبر میں چلائے گی بابا

انسان قدرتِ کائنات کے مظاہر میں غور وفکر کرے تو اسے ہر شے میں پروردگار عالم کی قدرت کی کارفرمائی نظر آئے گی۔ اگر وہ دنیاوی مظاہر پر غور کرنے سے قاصر ہے، تو وہ خود اپنی جسمانی ساخت پر غور وفکر

کرلے ،تو اس سے بھی خالق کائنات کی قدرت وصنعت کا اندازہ لگا سکتا ہے۔

نظیر آئینہ کے ذریعہ بنی آدم کے چہرہ پر توجہ مبذول کرانے کی سعی کرتے ہیں:

لے آئینے کو ہاتھ میں اور بار بار دیکھ
صورت میں اپنی قدرتِ پروردگار دیکھ

خالِ سیاہ اور خطِ مشک بار بار دیکھ
زلف دراز طرہ عنبر نثار دیکھ

ہر لحظہ اپنی چشم کے نقش و نگار دیکھ
اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

نظیر تصوفانہ مزاج کے باعث انسانی چہرہ میں صانع قدرت کا مشاہدہ کرتے ہیں تو وہ اپنے مخاطبین اور قارئین کو بھی اس طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں، جس کے لیے وہ شاعرانہ تشبیہ اور استعارہ کے ذریعہ صانع عالم کی کاری گری کا کیا خوبصورت اظہار کرتے ہیں:

سورج مکھی کے گل کی اگر دل میں تاب ہے
تو اپنے منہ کو دیکھ کہ خود آفتاب ہے

گل اور گلاب کو بھی تجھی میں حساب ہے
رخسار تیرے گل ہیں پسینا گلاب ہے

ہر لحظہ اپنی چشم کے نقش و نگار دیکھ
اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

نظیر نے تصوفانہ اور سیکولر مزاج کی رو سے عوام کو مخاطب کیا ہے۔ جس میں خاص طور سے ہندوستان کی مشترکہ تہذیبی روایت کو مدنظر رکھا ہے۔ ان کی شاعری عمومی طور پر بنی نوع انسان کے فکری اتحاد و ارتکاز کی حامل ہے۔ کلام نظیر میں ابن آدم ،مذہب وملت، ذات پات اور قومی نمائندہ سے بڑھ کر سب سے پہلے وہ انسان ہے۔ شاعر انسانوں کے مابین مذاہب وملل اور جغرافیائی حدود کے انقسام میں کسی بھی طرح کے مناقشہ، تنازع اور جنگ وجدل کا قائل نہیں ہے۔ ان کے کلام کا اساسی و مرکزی پہلو، رواداری، امن وامان اور بھائی چارہ ہے۔ انھوں نے 'اللہ کا نام' نظم میں یہ وعظ ونصیحت کی ہے کہ یہ دنیا دار فانی ہے۔ نیز ہم چند روزہ عارضی زندگی میں بھی حرص وہوس کا شکار ہوکر، باہم تیرے میرے کے جھگڑے میں پڑے ہوئے ہیں۔ طرفہ تو یہ کہ ہم پھر بھی محبت واخوت کے فطری جذبہ کے باہمی رشتہ کو زک پہنچاتے رہتے ہیں۔ جب نظیر خلقِ آدم کے مابین تنازعات اور حقارت آمیز رویہ سے پنپنے والے شدید استعصاب کا مشاہدہ کرتے ہیں تو وہ سبھی معاملات کو مدنظر رکھتے ہوئے متصوفانہ انداز میں یہ خیال پیش کرتے ہیں:

جھگڑا نہ کرے مذہب و ملت کا کوئی یاں
جس راہ میں جو آن پڑے خوش رہے ہر آں
زنار گلے یا کہ بغل بیچ ہو قرآں
عاشق تو قلندر ہیں نہ ہندو نہ مسلماں
کافر نہ کوئی صاحب اسلام رہے گا
آخر وہی اللہ کا ایک نام رہے گا

نظیر فقیرانہ طبیعت کے مالک تھے۔ اسی لیے ان کے ذریعہ اردو میں غیر روایتی انداز فکر کی سادگی سے پرسوقیانہ لب ولہجہ کی شاعری وجود میں آئی۔ وہ اسی کے واسطے اردو نظم کے سرخیل ثابت ہوئے۔ انھوں نے درویشانہ مزاج کے باعث کائنات کی ہر شے کو لائق اعتنا سمجھا۔ یہ بات درست ہے کہ خالقِ کائنات نے اپنی تخلیقات میں کوئی بھی چیز باطل پیدا نہیں کی ہے۔ اسی لیے نظیر نے مناظر قدرت کے مشاہدہ سے شاعری میں بھرپور استفادہ کیا ہے اور اس کی جیتی جاگتی تصویر پیش کرنے کی زبردست کوشش کی ہے۔ ایسے مناظر کو صوفی مزاج شاعر ہی شعری جامہ پہنانے کی جسارت کرسکتا ہے:

بولیں جیے، بٹیریں قمری پکارے کوکو
پی بھی پپیہا، بگلے پکاریں توتو
کیا ہدہدوں کی حق حق، کیا فاختوں کی ہو
سب رٹ رہے ہیں تجھ کو کیا پنکھ کیا پکھیرو
کیا کیا مچی ہے یارو، برسات کی بہاریں

نظیر قلندرانہ اور استغنائی طبیعت کی آزادانہ روش پر تاعمر قائم رہے۔ اسی لیے انھوں نے خود کو کسی بادشاہ، نواب اور امیر کے دست نگر ہونے سے باز رکھا۔ بلکہ اپنے اندر فقیرانہ قناعت کو بنائے رکھا۔ مزید حرص وہوس کی نفسیاتی بیماری سے بھی محفوظ رہے۔ ہاں انھوں نے اپنی ذات کو آگرہ کی مٹی کی بوباس میں اس قدر رچا بسا لیا تھا۔ جس سے جدا ہونا گوارا نہ کیا۔ اس کے لیے وہ دنیا سے طعنے سننے پر آمادگی کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ قلندر وصوفی ہی برداشت کرسکتا ہے:

عاشق کہو، اسیر کہو، آگرے کا ہے
ملّا کہو، دبیر کہو، آگرے کا ہے

مفلس کہو، فقیر کہو، آگرے کا ہے
شاعر کہو، نظیر کہو، آگرے کا ہے

بعض شخص مختلف تہذیبوں اور رنگوں میں بھی اپنی خاص شناخت قائم کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نظیر جیسا صوفی منش شاعر آگرہ کے معاشرے میں مختلف مذاہب، ذات پات اور پیشہ ورانہ لوگوں کے درمیان انسانیت کے پہلو کو اپنی فکر کا محور بناتا ہے۔

وہ 'آدمی نامہ' نظم میں انسان کے غالباً ۸۰ روپ پیش کرتے ہیں۔ ان سب میں آدمیت کے یکسانی پہلو کو مقدم رکھتے ہیں۔ جو بنی نوع انسان کے فکر و خیال میں تغیر و تحریک دلانے کے لیے بہت ہی سبق آموز ہے۔ کیونکہ کوئی بھی انسان مقام و مرتبہ کے امتیاز کے باوجود آخر آدمی ہی تو ہے۔ یہی وجہ ہے، انھوں نے کسی خاص مذہب، ذات اور پیشہ سے امتیازی شناخت کے لیے دلچسپی نہیں دکھائی۔ انھوں نے بلا تامل اپنی شعری تخلیقات میں آگرہ شہر کے بیشتر پیشہ ورانہ کاروباریوں ،مختلف مذاہب کے تہواروں اور ذات پات کے لوگوں کا مختصر خاکہ پیش کر دیا ہے۔ ان میں بے شک بہت سے آدمی پیشہ کے اعتبار سے لائق تحسین اور حقیر ضرور سمجھے جاتے ہیں۔ نظیر نے انسانی طرز معاشرت میں رائج امتیازات سے قارئین کو باور کرا دیا ہے مگر انسان کے جملہ امتیاز پر آدمی کے اساسی پہلو کو فوقیت دی ہے۔ جو تصوف کا اہم نقطۂ نظر بھی ہے۔

دراصل نظیر نے اپنی نظموں میں انسانی زندگی اور کائناتی حقائق کی اچھوتے انداز میں ترجمانی ہے۔ ان میں ہم بہ آسانی آدمی کے اخلاقی اور استغنائی فکر کا خاکہ دیکھ سکتے ہیں۔ انھوں نے بڑی سبق آموز نظمیں لکھی ہیں جن میں بنی آدم کی توجہ فنائے کل اور بقائے رب کی جانب مبذول کرائی ہے اور یہ بھی باور کرایا ہے کہ انسان اصل مقصد سے بھٹک کر دنیاوی طرز معاشرت کے فریب میں پھنس جاتا ہے۔ اسی لیے وہ عالم ناسوت کی تمام فریب آمیز رنگارنگی میں مقام و شہرت کا متمنی نظر آتا ہے۔ وہ ان تمناؤں کو بروئے کار لانے کے لیے زر کی اہمیت کو مقدم رکھ کر سرگرداں اور مضطرب رہتا ہے۔ شاعر نے اپنے کلام میں انہی پہلوؤں کو پیش نظر رکھا ہے اور اپنے حکیمانہ نکات کو عام فہم زبان میں بنی نوع انسان کے لیے بطور درس و نصیحت پیش کر دیا ہے۔ وہ آدم خاکی کو قناعت پسندی کا سبق کچھ اس طرح دیتے ہیں:

تو لاکھ اگر مال کے صندوق بھرے گا
ہے یہ تو یقیں، آخرش اک دن تو مرے گا
پھر بعد تیرے اس پہ جو ہاتھ دھرے گا
وہ ناچ مزا دیکھے گا اور عیش کرے گا
اور روح تیری قبر میں چلائے گی بابا!

لاریب ہر انسان کو دنیا کی بے ثباتی پر یقین کامل ہے۔ تاہم انسان دنیا کے جھمیلوں اور حرص و ہوس میں مبتلا ہو کر غفلت کا شکار ہو جاتا ہے، مگر صوفی منش شخص نظیر کو دنیا کی ناپائیداری کا احساس لاحق تھا۔ اسی لیے انھوں نے شاہ و نواب کے در دولت سے وابستگی گوارا نہ کی۔ جب ہم تصوفانہ مزاج و آہنگ سے مطابقت رکھنے والی نظموں کا مطالعہ کرتے ہیں تو قاری کو دنیا کی اس صداقت کا احساس ہوتا ہے کہ دنیاوی جملہ مشاغل اور باہمی رشتہ سب فانی ہیں۔ ہم اس حقیقت کا فکری پیکر الٰہی نامہ، موت، اللہ کا نام، نیکی و بدی، فنا نامہ، ہنس نامہ، بنجارہ نامہ، چڑیوں کی تسبیح، اپنی بہار، فقیروں کی صدا، مرد اور آئینہ۔ وغیرہ نظموں میں دیکھ سکتے ہیں۔ جہانِ فانی میں جاندار اور غیر جاندار کی بے ثباتی جگ ظاہر ہے۔ انھوں نے فنا نامہ نظم میں یہ اظہار کیا ہے کہ یہاں مبعوث انبیا، حکما اور فلسفی ہر کوئی موت کے سامنے بے بس ہے۔ مزید یہ باور کرایا کہ ہم سب اس دنیا میں مسافر کی مانند ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہمیں اپنے طرز زندگی کے لیے اختیار و انتخاب کا شعور عطا کیا گیا ہے۔ جس کے باعث ہم اپنے اعمالِ خیر و شر کے لیے ذمہ دار ہیں۔

نظیر اس بارے میں بظاہر کوئی رائے نہیں دیتے، صرف اس حقیقت کا فکری اظہار کرتے ہیں کہ دنیا کی تمام چیزیں وقت کے ساتھ پیدا اور ختم ہوتی رہیں گی۔ آخر کار خالق حقیقی یعنی اللہ کا نام ہی ہمیشہ باقی رہے گا:

جو شاہ کہاتے ہیں کوئی ان سے یہ پوچھو
دارا و سکندر وہ گئے آہ کدھر کو
مغرور نہ ہو شوکت و حشمت پہ وزیرو
اس دولت و اقبال پہ مت بھولو امیرو
نے ملک نہ دولت نہ سر انجام رہے گا
آخر وہی اللہ کا ایک نام رہے گا

یہ باغ و چمن اب جو ہر اک جا میں رہے پھول
یہ شاخ، یہ غنچہ۔ یہ ہرے پات، یہ پھول پھول

آجاوے گی جب بادِ خزاں ان کے اُپر بھول
ہر خار کی، ہر پھول کی اڑ جائے گی سب دھول
نے زرد نہ سرخ اور نہ سیہ فام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

نظیر اکبرآبادی کی نظموں میں وحدت الوجود اور معرفت الٰہی سے متعلق باتیں بھی جابہ جا ملتی ہیں۔ جن میں خاکِ بشری کی، معرفت نفس کے شعور پر توجہ مبذول کرائی ہے کہ اس دنیا کے اعمالِ حسنہ ہی توشہ آخرت ہیں۔ جو بنی آدم کے لیے غیر فانی ہیں۔ ہاں دنیاوی حیات وزیست میں جسمانی ساخت فانی ہے۔ شاعر نے آخرت کی زندگی کو مدنظر رکھتے ہوئے، نوع بشر کو دنیاوی زندگی کی نیرنگیوں سے پرہیز کی تلقین کی ہے۔ انھوں نے جہان فانی کی بے ثباتی کی حقیقت کا ذکر بڑے تاثر آمیز اسلوب میں کیا ہے۔ شاعر کا ان سب باتوں پر زور دینے کا مقصد یہ ہے کہ انسان کرۂ ارض پر امن وامان، الفت ومحبت اور اخوت ومودت کے ذریعہ اخلاقیات اور انسانیت کا پیکر بن جائے۔ جو ہر مذہب اور مکتب فکر کا مرکزی نقطہ بھی ہے۔ اگر بنی نوع انسان اپنے فقر وقناعت کو بروئے کار لاکر عملی پیکر بن جائے۔ تو دنیا ہر صورت میں انسان میں خوشی وشادمانی کا گہوارہ نظر آئے گی۔

نظیر یقینی طور پر کہتے ہیں:

جو فقر میں پورے ہیں وہ ہر حال میں خوش ہیں
ہر کام میں ہر دم میں ہر حال میں خوش ہیں
گر مال دیا یار نے تو مال میں خوش ہیں
بے زر جو کیا تو اسی احوال میں خوش ہیں
افلاس میں ادبار میں اقبال میں خوش ہیں
پورے ہیں وہی مرد جو ہر حال میں خوش ہیں

نظیر نے نظم 'ہنس نامہ' میں بڑے تمثیلی انداز میں انسان کو یہ باور کرایا ہے کہ آخر کار ہمیں یہ دنیا چھوڑ کر جانا ہے اور عموماً ہمارے ساتھ کوئی عزیز واقربا نہیں جائے گا۔ اسی لیے یہاں پر کسی بھی شے سے بے جا التفات بے معنی ہے۔ یہ بند قابلِ غور ہے:

دنیا کی جو الفت ہے تو اس کی ہے یہ کچھ راہ
جب شکل یہ ہووے تو بھلا کیونکر ہو نرباہ
ناچاری ہو جس جا میں تو واں کیجیے کیا چاہ
سب رہ گئے جو ساتھ کے ساتھی تھے نظیر آہ
آخر کے تئیں ہنس اکیلا ہی سدھارا

یہ بدیہی حقیقت ہے کہ انسان کو دنیا کی تمام نیرنگیوں اور عیش و آسائش کو چھوڑ کر جانا ہے پھر بھی نہ جانے ہم اعلیٰ وادنیٰ، اشرف واجلف اور مذہب وملت کے شدید تعصّبات کیوں روا رکھتے ہیں؟ کہ ہر انسان کو اپنے عقیدے کے طور پر جینے کا استحقاق اور آزادی حاصل ہونی چاہیے۔ مزید یہ بھی کہ دنیا دارالمکافات ہے اور یہاں پر بھی انسان اپنے کیے کی جزا وسزا جزوی طور پر ضرور پاتا ہے۔ کیونکہ اس دنیا میں بھی خالقِ حقیقی نے اپنی مشیت کے مطابق بہت سی چیزوں کی جزا وسزا مقرر کی ہے۔ یہ سب باتیں سخن ور کے تصوفانہ مزاج پر دال ہیں۔

پروفیسر عبدالستار ردولوی نظیر کے تصوفانہ فکر کے تعلق سے اظہار خیال کرتے ہیں:

> ''انسان ہونے کی حیثیت سے مختلف العقائد اور رنگارنگ رسوم وقیود کی پابندی کے باوجود انسان ہونے کی بنیادی حیثیت میں کوئی فرق نہیں آتا اور اس حیثیت کو، کہ سارے انسان اپنی انسانیت کے ناطے برابر کا درجہ رکھتے ہیں موت ثابت کر دکھاتی ہے۔ نظیر اکبرآبادی نے اپنی ایک سے زائد نظموں میں انتہائی مؤثر انداز میں ان خیالات کو دہرایا ہے۔ یہ نظمیں محض صوفیانہ، خداپرستی کی مظہر نہیں ہیں بلکہ انسانوں میں جو عدم مساوات رائج ہے اس کے خلاف احتجاج کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔''

(گلزار نظیر، مرتبہ سلیم جعفر آبادی، ص:۲۷۴)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ نظیر اکبرآبادی کو خالص صوفی شاعر تو تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ ان کے کلام میں مربوط صوفیانہ مضامین نہیں ملتے۔ ہاں مگر ان کی بہت سی نظموں میں صوفیانہ طرز فکر کے بند اور اشعار جا بجا ملتے ہیں۔ جو انسانی ذہن میں مادی دنیا کی بے ثباتی کا زبردست پیکر بناتی ہیں۔ جو صوفی منش شاعر کا شیوۂ خاص ہوتا ہے۔ ان کے ایسے کلام کا مطالعہ ہمیں یہ احساس کراتا ہے کہ انھوں نے صوفیانہ طبیعت پائی تھی۔ اسی لیے وہ خالق کائنات کی ہر چھوٹی بڑی چیز سے ہمدردی اور عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔ شاعر نے کلام کے ذریعہ انسان کو زمانہ کے نشیب وفراز سے آگاہ کرنے کی خوب سعی کی ہے۔

نظیر کو یہ بخوبی علم واحساس تھا کہ جہان فانی میں زندگی کی شان وشوکت اور جلال وجمال سب عارضی چیزیں ہیں جو ایک روز ضرور ختم ہو جائیں گی اور حقیقی صوفیوں کا بھی یہی مسلک رہا ہے۔

◆◆◆